ساری وادی میں اپنے ٹینٹ لگا کر دور دور تک پھیل جاتی تھیں۔ صبح کے وقت جوان ڈھلانوں ہی پر ڈرل کرتے تھے، ڈھلانوں ہی پر فارمیشن بنا کر مارچ کرتے تھے — مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے۔"

"لیکن آپ کب یہاں آ کر آباد ہوئے؟" دانیال نے پوچھا "اور آپ کو کس طرح یہاں رہنے کا خیال آیا؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے" ملک مروت نے کہا "اور اس قدر طویل ہے کہ اگر میں اسے اب شروع کرتا ہوں تو نہ تو آپ اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی میں اپنا فرض سرانجام دے سکتا ہوں۔ پھر کسی وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔"

"بہت خوب!" دانیال نے قدرے بے تکلفی سے کہا "گویا اس کے بعد ہماری ملاقات پھر بھی کبھی ہو سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں!!" ملک مروت نے یقین کے ساتھ کہا "دنیا امید پر قائم ہے اور اسی قیام ہی سے دنیا کا نظام ہے۔ ہم کیوں نہیں ملیں گے بھلا — ہم ضرور ملیں گے۔"

"لیکن کیسے؟" دانیال نے پوچھا۔

"ایسے ہی جیسے ہم اب مل گئے ہیں..... اتفاق سے، مقدر سے، ایک حادثے کی وجہ سے جو رک گیا یا ایک طے شدہ وقت کی وجہ سے جو کسی اور وقت میں پہلے طے پا گیا ہے یا پھر ایسے ہی اس سنکرونائی کی وجہ سے جو ہم دونوں کے درمیان موجود ہے، یا کہیں سے آ موجود ہوئی ہے — بہت ساری وجہیں ہیں۔" ملک صاحب نے کہا "اتنی ساری کہ ہم انہیں شمار بھی نہیں کر سکتے۔"

دانیال بڑی دیر ان کے سامنے بیٹھا علم و حکمت کی باتیں سنتا رہا۔ پہلے تو اس نے گفتگو میں شرکت بھی کی۔ چند ایک سوال بھی پوچھے لیکن جب ملک مروت اس کے دل کی گہرائیوں تک خود ہی پہنچ گئے تو اس نے سوال کرنا بند کر دیئے اور اس چوزے کی طرح ملک صاحب کے سامنے بیٹھ گیا جسے سانپ سونگھ رہا ہو۔

بڑی دیر باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے ملک صاحب کے چہرے پر ہلکی ہلکی تھکاوٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ انہوں نے اکلوتی پرانی گھڑی کو دیوار پر دیکھا اور

چونک کر کہا "اوہ باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا۔ اب تو آپ کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ باہر دھند چھٹ گئی ہے اور راستہ بالکل صاف ہوگیا ہے۔"

دانیال نے گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو باہر سورج چمک رہا تھا اور کھڑکی میں سے اس کی روشنی پرانے شکارگاہ پر پڑ رہی تھی۔ وہ شکریہ ادا کر کے اٹھا تو ملک صاحب بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے سر کی بیلا کلاوہ اتار کر میز کے کنارے پر رکھ دی اور دانیال کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئے۔

تیز دھوپ پہاڑوں کی چوٹیوں سے لے کر نیچے وادیوں تک ایک سار پھیلی ہوئی تھی اور اس نے جگہ جگہ درختوں کے گہرے جھنڈوں کو بھی اجال رکھا تھا۔ دانیال کو یہ دیکھ کر ایک زور کا چکر آیا اور وہ ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ اس کی موٹر تیز دھوپ کے اندر پہاڑ کی ایسی چوٹی پر کھڑی تھی جس کے چاروں طرف گہری وادیاں تھیں اور اس چوٹی تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اپنی موٹر کو ایسے مقام پر دیکھ کر اس نے حیرت سے ملک صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "بس اسی لیے میں تڑپ کر اپنے گھر کے پھاٹک سے آپ کی جانب بھاگا تھا کہ آپ کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے لیکن خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ایسا نہیں کیا اور آئی بلا ٹل گئی۔"

دانیال نے کہا "لیکن سر یہ میری موٹر وہاں کیسے پہنچ گئی؟"

"کمال ہے بھئی" ملک صاحب نے ہنس کر کہا "چلا کر خود لائے اور اب پوچھ مجھ سے رہے ہو۔"

"لیکن یہ وہاں سے اترے گی کیسے؟"

"اس کی فکر نہیں۔" ملک صاحب نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "جو یہاں پہنچ گئی ہے، وہ واپس بھی جا سکتی ہے۔"

پھر راستے میں دانیال نے ملک صاحب سے جتنے بھی سوال کیے، ملک صاحب نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ وہ پوچھتا رہا اور وہ چلتے رہے۔

جس پہاڑی کی چوٹی پر موٹر کھڑی تھی، اس کے ساڑھے تین طرف تو آٹھ

آٹھ ہزار فٹ گہری وادیاں تھیں البتہ چوتھی جانب جھاڑ جھنکاڑ سے پر ایک ایسی نچان تھی جو چوٹی سے تیس چالیس فٹ نیچے تھی۔

الٹی طرف رخ کیے کھڑی گاڑی کو بیک کر کے اس نچان پر اتارنا تو ایک طرف رہا کوئی شخص اسے سیدھے رخ بھی اتنی نچان پر نہیں اتار سکتا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں فولادی رسہ ڈال کر اور اس کے کنڈے کو گاڑی کے اگلے یا پچھلے بمپر میں اتار کر البتہ ٹرالی کی طرح لٹکا کر پکی سڑک پر لایا جا سکتا تھا..... لیکن ہیلی کاپٹر کا حصول ناممکن تھا!

جب وہ دونوں موٹر کے قریب پہنچے تو ملک مروت نے ہاتھ بڑھا کر موٹر کی چابیاں طلب کیں اور اپنا چترالی چغہ اتار کر دانیال کے حوالے کر دیا۔

جب ملک صاحب نے گاڑی کے اندر بیٹھ کر موٹر سٹارٹ کی تو دانیال نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

موٹر کے تھروٹل نے ایک زور کی چنگھاڑ ماری اور تینوں وادیاں ایک ساتھ گونج اٹھیں۔ پھر گاڑی تیزی کے ساتھ بیک ہوئی اور بڑی دکھی آواز میں چالیس فٹ نچان پر کی ماؤس کی طرح بھاگتی ہوئی صاف راستے پر آ کر رک گئی۔ دانیال نے آنکھیں کھول کر دیکھا ملک صاحب سٹارٹ موٹر کے پہلو میں کھڑے ہاتھ کے اشارے سے دانیال کو اپنے پاس بلا رہے تھے۔

دانیال نے موٹر میں بیٹھنے سے پہلے دو ہاتھوں سے ملک صاحب کے ساتھ مصافحہ کیا اور گلوگیر آواز میں بولا "اگر آپ یہاں موجود نہ ہوتے تو میں نے اب تک فوت ہو جانا تھا۔"

"خدا نہ کرے!" ملک صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا "موت کا تو ایک وقت اور مقام مقرر ہے۔ نہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے آ سکتی ہے نہ اس کے بعد۔"

چلنے سے پہلے دانیال نے کندھوں تک اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال کر کہا "ملک صاحب میں آپ کا کارڈ لینا تو بھول ہی گیا اگر اس وقت جیب میں ہو تو عنایت فرما دیجئے۔"

ملک صاحب نے ولایتی لوگوں کی طرح کندھے اٹھا کر اور سر اندر دھنسا کر

دونوں خالی ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس وقت تو نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو نہیں دیتا کہ آپ نے میرا غریب خانہ تو دیکھ ہی لیا ہے۔ جب جی چاہے، آئیں اور شوق سے آئیں بلکہ — اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ اصل گھر!"

دانیال دونوں ہاتھ ماتھے کو لگاتا اور ملک صاحب کا شکریہ ادا کرتا شیشہ چڑھا کر اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ پکی سڑک پر اپنی کار دوڑاتے اور دو سپیکروں والے کیسٹ ریکارڈر پر ایمن کلیان سنتے ہوئے دانیال نے سوچا کہ اللہ کے بزرگ کیسے کیسے روپ میں کہاں کہاں پڑے ہیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ گنجلک پہاڑوں اور نوکیلی چوٹیوں کے درمیان ایک ایسا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ گھر کہہ لیجئے یا پرانی وضع کا کلونیل بنگلہ کہہ لیجئے۔ بنگلے کے اندر جنگلے والا آتش دان دیکھ لیجئے، پھر وکٹورین طرز کا فرنیچر ملاحظہ فرما لیجئے۔ فرنیچر کی پھبن کے اندر ایک گریس فل ہستی دیکھ لیجئے۔ ایسی ہستی جو نہ جوان ہے نہ بوڑھی، نہ سرخ و سپید ہے نہ سانولی، نہ ہنسوڑھے نہ سنجیدہ، نہ دبلی پتلی ہے نہ بھاری بھرکم، نہ احسان دھرتی ہے نہ کنارہ کرتی ہے بس اپنی موجودگی کا احساس دلاتی چلی جاتی ہے۔

دانیال کے دل پر اس عظیم ہستی کی محبت پھوار بن کر اتری اور پھر شراٹے دار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی روح کے ندی نالے جل تھل ہو گئے۔ خیالوں کے ساتے محبت کے سیلاب میں ڈوب گئے اور وہ ملک صاحب کی اتھاہ محبت میں اتنا گہرا اتر گیا کہ اسے سامنے سے اینٹیں لانے والا ٹریکٹر اور ٹرالا نظر نہ آیا۔ پہلے وہ ٹریکٹر کے مڈگارڈ سے ٹکرایا اور پھر ٹرالے کی بڑھی ہوئی چوڑائی نے اس کی کار کو اٹھا کر اٹھارہ بیس فٹ گہرے نشیب میں پھینک دیا۔ کار چھ سات لڑھکنیاں کھاتی ہوئی ایک پرانے نالے کے چھچھلے پیندے میں اتر گئی۔

اپنے سر، ماتھے، گردن اور کندھوں پر سفید براق پٹیاں بندھوا کر اور ایتھر، سپرٹ اور مختلف ٹنکچروں میں نہا کر جب دانیال اکیلا ہی پرمٹ آپریشن روم سے باہر نکلا تو اسلام آباد کمپلکس کے برآمدوں سے پیلی دھوپ واپس جا رہی تھی۔ سامنے خوبصورت بنگلوں کے پیچھے مرگلہ کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہسپتال کے بندے دکھائی نہیں دیتے تھے البتہ مریضوں کے لواحقین برآمدے کے اندر دیواروں

سے ڈھو لگائے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ دانیال ان کی طرف کوئی خاص توجہ دیے بغیر آگے نکل گیا۔

گُر بھر گرمیوں کا موسم تھا لیکن آج کا دن بہت ہی خوشگوار تھا۔ لمبے برآمدے کے آخر میں، بہت دور اس نے ملک مروت کو اپنی جانب تیزی سے آتے دیکھا تو دانیال نے بھی ان کی پذیرائی کے لیے اپنی رفتار تیز کر دی۔

ملک صاحب نے ہلکے نیلے رنگ کا ڈبل بریسٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے پیتل کے بٹن ہلکی سی روشنی پڑنے پر بھی تیز تیز لشکارے مار رہے تھے۔ ملک صاحب مسکراتے ہوئے دانیالؑ کی جانب بڑھ رہے تھے اور ان کا چہرہ موزیک پر پڑتی ہوئی دھوپ کے عکس میں شدت سے جگمگا رہا تھا — دانیال کے قریب آتے ہوئے انہوں نے اپنے دونوں بازو آگے پھیلا کر اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اپنی پٹیوں میں لپٹا ہوا دانیال جوگنگ کے انداز میں آگے کو جھک کر تیز تیز قدم مارنے لگا اور جلد ہی ملک صاحب کے کھلے ہوئے بازوؤں میں جھول گیا۔

ملک صاحب نے بڑے دلار سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اسے اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے کہا "ابھی جب آپ میرے یہاں تشریف لائے تھے تو آپ کو میری نیم پلیٹ پڑھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ میرا نام ملک مروت نہیں، ملک الموت ہے۔ ایک بھرنویں سی جنگلی بیل جو میری نیم پلیٹ کے درمیان سے اوپر گزر گئی ہے، اس نے میرے نام کے "الموت" کو چھپا لیا ہے اور تیز ہوا چلنے سے وہ جب بھی ہلتی ہے "الو" "مرو" لگتا ہے۔ لیکن یہ سب زبان کی املائی ساختیات کے روپ ہیں اور اس وقت جو ہم اپنی اپنی اہم ڈیوٹی پر مامور ہیں، ہمیں املا سے اور قواعد سے کیا لینا ہے۔ ہمیں تو اپنا فرض نبھانا ہے۔"

پھر اس نے بڑی محبت کے ساتھ دانیال کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "ہر کام کے لیے وقت اور مقام طے ہوتا ہے۔ آپ میرے غریب خانہ پر پہلے ہی تشریف لے آئے، اس کا شکریہ لیکن وہ طے شدہ وقت سے ذرا پہلے تھا۔" پھر وہ دونوں لمبے لمبے، میٹھے میٹھے اور موٹے موٹے قدم اٹھاتے ہسپتال کے خاموش برآمدے سے باہر نکل گئے۔

سونی

جب ملک التجار شمس الدین کے بیٹے بختیار کی شادی ملک التجار حسن دین کی بیٹی فجستہ سے ہوگئی تو دونوں گھرانوں نے اس لگن کو اپنی خوش قسمتی جانا اور دولہا و دلہن کو اتنا مال دیا کہ ان کے آنے والے سات سال کی ضرورتیں ایک ہی دن میں پوری ہوگئیں۔

فجستہ اور بختیار امیر ترین گھرانوں میں پیدا ہونے کی وجہ سے بہت ہی شریف بچے تھے اور انہوں نے اپنی زندگیوں میں کبھی کوئی گندی بات نہیں کی تھی۔ فجستہ نے ایم اے سائیکالوجی کیا تھا اور وہ یونیورسٹی میں اول آئی تھی۔ بختیار نے ایم بی اے کیا تھا اور اس کو فرسٹ کلاس فرسٹ کی ڈگری مل چکی تھی۔ دونوں نے اپنی زندگی میں چونکہ سوائے اپنے کام کے اور سوائے اپنے نام کے اور کسی چیز سے محبت نہیں کی تھی اس لیے وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے اور انہیں پہلی دفعہ پتہ چلا کہ دام کے مقابلے میں چام سے بھی اتنی ہی محبت کی جا سکتی ہے اور اس میں بھی بڑا مزہ آتا ہے — دونوں کے والدین اس بات پر نازاں تھے کہ ان کے بچے اگر ہم خیال نہیں تو ہم حال ضرور ہیں اور شادی اور دوستی میں ہم خیال ہونا اتنا ضروری نہیں جس قدر ہم حال ہونا ضروری ہے۔

فجستہ اور بختیار کے پاس اپنی کاریں تھیں لیکن دونوں کے میک مختلف، رنگ مختلف، گیئر مختلف اور دونوں کی "کنٹریز آف اورجن" الگ الگ تھیں۔ ایک فرنٹ وہیل ڈرائیو تھی، دوسری پچھلے پہیوں کے زور پر تھی۔ دونوں کے پاس اپنا اپنا میوزک سسٹم تھا۔ ایک کے پاس جاپان کا ڈولبی سسٹم تھا، دوسرے کے پاس سویڈش اوپن ریل

ٹیپ ریکارڈر تھا۔ ایک کو دو سپیکر لگے تھے، دوسرے کو چار ۔۔۔ دونوں کے پاس بے شمار سوٹ تھے لیکن ایک کے زنانہ تھے اور دوسرے کے مردانہ۔ ایک کو شوخ رنگ پسند تھے، دوسرے کو صوفیانہ۔ ایک کو مسک بیس والا پرفیوم پسند تھا، دوسرے کو روز کا بھکا بھک۔ لیکن استعمال دونوں ہی فرنچ پرفیوم کرتے تھے۔ دونوں کے والدین خوش تھے کہ اللہ کا شکر ہے یہ ہم حال ہیں، اگر صرف ہم خیال ہوتے تو کافی مشکل پڑ جانی تھی۔ انہیں مزید ہم حال رکھنے کے لیے دونوں کے والدین وقتاً فوقتاً ان کو اور چیزیں بھجواتے رہتے اور ان کی ضرورتوں کا ان سے بڑھ کر خیال رکھتے۔

جب وہ دونوں ولایت سے ہنی مون منا کر لوٹے تو ان کو کسٹم پر بہت دیر رکنا پڑا کیونکہ وہ اب اور بھی ہم حال ہو کر لوٹے تھے اور ان کا بیگج بے شمار ٹرالیوں پر پھیل کر مختلف کاؤنٹروں پر پڑا تھا۔

آج کل کے امیر اور صاحب حیثیت لوگوں کے بچوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کو ہر حال میں لائق ہونا پڑتا ہے اور اپنے والدین سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔

پہلے زمانے میں امیروں کے بچے لاڈلے، نالائق اور عیاش ہو جاتے تھے اور غریبوں کے محنتی، جفاکش اور مستعد بچے ان سے آگے نکل جاتے تھے۔ اب یہ بات نہیں رہی۔ اس وقت یونیورسٹیوں، کالجوں، اداروں، درس گاہوں میں اول آنے والے سب امیروں کی اولاد ہوتے ہیں۔ صاحب حیثیت لوگوں کے بچے ہر وقت غریبی اور افلاس کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ یہ خوف ایک چھوت کی بیماری بن کر ان کی روحوں میں سرایت کر گیا ہے اور وہ ہر طرح کی لذت اور ذائقے سے محروم ہو گئے ہیں۔

فجستہ اور بختیار کے درمیان بھی جس لذت اور ذائقے نے جنم لیا تھا، وہ ہنی مون سے واپسی پر آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگا اور دونوں اپنی اپنی ذات کو الگ الگ ہینگر پر ڈال کر اسے برش کرتے ہوئے اپنی شخصیت نکھارنے لگے۔ گنوار لوگوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ دارے اور گوماں کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی لذت میں عمر بھر کے لیے گم ہو کر ترقی کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کو جو وقت بھی ملتا ہے، وہ

بجائے آگے بڑھنے کے اسے ایک دوسرے پر صرف کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں گنوار لوگ سب سے پیچھے ہیں اور ان اندوختوں سے محروم ہیں جو آج کا مہذب انسان دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے اور جس نے اس دنیا کو ارضی جنت بنا رکھا ہے۔

تو جناب بختیار اور فجستہ کے درمیان محبت اور لذت تو ختم ہوگئی لیکن ان کے درمیان انڈر سٹینڈنگ بہت بڑھ گئی۔ وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے اور آپس میں بہت ہی محبت بھرے انداز میں گفتگو کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان کی ہم حالی میں ہم خیالی بھی پیدا ہونے لگی۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے مذاق کو سمجھنے لگے بلکہ ایک دوسرے کو داد بھی دینے لگے۔ ان کی زندگی یو این جیسی خلیق، ملنسار، مہذب اور شائستہ ہوگئی اور وہ انڈرسٹینڈنگ کی چاشنی میں اس طرح سے رچ گئے کہ اٹھتے بیٹھتے ان کے منہ سے بار بار تھینک یو، ڈیئر، ہنی، سویٹ، کیوٹ نکلنے لگا۔

بختیار کے پاس پانچ کیمرے، دو وی سی آر، آٹھ ٹیپ ریکارڈر، دو ٹائپ مشینیں، ایک ہوم کمپیوٹر، تیس جگ سا پزل، ایک سولہ ایم ایم دو آٹھ ایم ایم پروجیکٹر، اکیس مربع فٹ لمبے ٹریک پر چلنے والی تیئس بوگیوں والی ایک ریل گاڑی، دو انجن: ایک ڈیزل ڈیزائن دوسرا کوئلہ شکلی، ان کے ساتھ دو ریلوے سٹیشنوں کی عمارتیں: ایک جنکشن کی دوسری فلیگ سٹیشن کی، پانچ کانٹے، تین سگنل، نو کانٹا بدلیاں، ایک گہری سرنگ، سات لیول کراسنگ تھے۔

دو بیس وولٹ کے ریگولیٹر سے فیڈ ہوکر جب یہ ٹرین بڑے سٹیشن سے چلتی تو کلکتہ سے بردوان آنے والے دیوداس کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ٹرین کی یہ چلت تین فٹ اونچے مہاگنی کے ٹیبل پر بندھی تھی اور یہ ٹیبل نوے بائی ستر فٹ کے اس Basement میں رکھا تھا جہاں بختیار کی دوسری ساری واستگیاں پڑی تھیں۔ بختیار کا یہ Den اس کی ساری زندگی تھی..... موجودہ بھی اور مابعد کی بھی، Here بھی Hereafter بھی۔ یہیں ایک کونے میں اس کا Ham ٹرانسمیٹر نصب تھا جہاں بیٹھ کر وہ دنیا کے دوسرے ہابی اسٹ براڈکاسٹروں سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی Stray سگنل رات کے نو بجے اس کی فریکوئنسی کے چنگل سے نکل جاتا تو وہ صبح تین

چار بجے تک اس کا پیچھا کرتا رہتا۔ یہیں ایک سٹینڈ پر اس کے ایئر ماڈل رکھے تھے جن میں سے ایک گیارہ میل کی مسافت طے کر کے سانگلہ ہل کی چوٹی پر لینڈ کر گیا تھا جسے اس نے پورے نو دن سگنل دے دے کر بڑی مشکل سے ٹریس کیا تھا اور خود جا کر اسے پہاڑ کی چوٹی سے اٹھا کر لایا تھا۔ اسی ڈین میں اس کا چھوٹا سا کوکنگ رینج تھا جس پر وہ آدھی رات کے بعد کافی اور چیز اینڈ مشروم کے سینڈوچ تیار کر کے کھایا کرتا تھا۔

ہر روز صبح ناشتے کی میز پر بختیار اور فجستہ کی ملاقات ہوتی اور دونوں ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو اپنے اپنے اخبار کی خبریں سنایا کرتے۔ حالات حاضرہ پر دونوں کی نظر بڑی گہری تھی اور تھرڈ ورلڈ کے مسائل کو وہ ڈیولپڈ کنٹریز سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ فجستہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں سوشلسٹ تھی اور اب بھی اس کی سوچ وہی تھی۔ بختیار شروع سے Fundamentalist تھا۔ دونوں کے نظریات الگ الگ تھے لیکن دونوں میں بلا کی انڈرسٹینڈنگ تھی۔ آزاد خیالی کی وجہ سے دونوں میں نظریاتی جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہت ہی خوش تھے کیونکہ دونوں اپنی اپنی راہ پر سیدھے چل رہے تھے..... پھر اچانک یوں ہوا کہ بختیار کو بزنس ٹرپ پر فارایسٹ جانا پڑ گیا۔ دورہ تو ایک مہینے کا تھا لیکن ایک ان ہونی مجبوری کے باعث لمبا ہو گیا۔

جس دن بختیار سفر پر جانے لگا، اس روز اس کے اور فجستہ کے درمیان تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا۔ فجستہ نے کہا "بختیار! تم اپنا ایک وی سی آر مجھے دیتے جاؤ تاکہ اگر خدانخواستہ میرا خراب ہو جائے تو میں اور میری فرینڈز فلمیں دیکھنے سے محروم نہ رہ جائیں۔" بختیار نے کہا "تم اپنے لیے ایک اور خرید لو لیکن میرا کیمٹ مجھ سے نہ مانگو۔ میں ان سے وابستہ ہو جاتا ہوں تو ان کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ ان میں میری جان ہے۔"

بختیار کا یہ جواب سن کر فجستہ سکتے میں آ گئی اور چپ رہ گئی۔ اس کو ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ بختیار اس کے علاوہ کسی اور کو اپنی جان کہے گا — دونوں تھوڑی دیر ایک دوسرے کے آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بختیار اٹھا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا نیچے تہہ خانے میں اتر گیا۔ اس نے فلپس کا وی سی آر اٹھایا اور اس کو سینے سے لگا کر اوپر آ گیا۔ فجستہ ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ وی سی آر لا کر اس نے

ایلومینیم کی چھوٹی تپائی پر رکھا تو فجستہ نے کہا "مجھے یہ نہیں چاہیے۔ مجھے دوسرا چاہیے' سونی!"

"سونی" کا نام سنتے ہی بختیار کا دل بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں کے پیچھے بہت سارے آنسو امڈ آئے لیکن اس نے یہ معاملہ فجستہ پر نہیں کھلنے دیا اور جوکر کی طرح مسکرانے لگا۔

فجستہ نے کہا "جناب کی بڑی مہربانی' شکریہ۔ یہ لے جائیے اور اس کی جگہ سونی لے آئیے۔" بختیار نے سر جھکا کر کہا "وہ تو میں کسی صورت میں بھی نہیں لا سکتا۔ اس کو تو میں نے ابھی تک چیک بھی نہیں کیا۔ صرف ڈبے سے نکال کر شیلف پر رکھا ہے۔"

"تو کیا ہوا!" فجستہ نے ڈھٹائی سے کہا "استعمال کی چیز ہے' استعمال کے لیے بنی ہے اور استعمال کے لیے ہی خریدی گئی ہے۔"

سونی وی سی آر کے لیے استعمال کا لفظ سن کر اور اس دیدہ دلیری پر دلگیر ہو کر ملک التجار بختیار کی روح بلبلا اٹھی۔ اس نے دردناک لہجے میں کہا "سونی واقعی میری جان ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کسی کو نہیں دے سکتا۔ میرے بعد خود اٹھا کر لے جانا' بڑے شوق سے۔"

فجستہ نے بختیار کا چہرہ دیکھا تو اس کو فکر پڑ گئی۔ اس کی رنگت فرقت زدہ انسان کے چہرے جیسی ہوگئی تھی اور اس کی آنکھیں ایک دم سے بے نور سی ہوگئی تھیں۔ اس نے مسکرا کر کہا "اگر مجھے ضرورت پڑی تو نکالوں گی ورنہ اسی پر' اپنے والے پر دیکھتی رہوں گی — کوئی ضروری تو نہیں بختیار کہ میرے والا خراب ہو جائے۔"

"بالکل! کوئی ضروری نہیں' لازمی نہیں کہ تمہارے والا خراب ہو جائے — ہو گا بھی نہیں — لیکن اگر ضرورت پڑے تو نکال بھی لینا۔ لیکن انشاء اللہ ضرورت نہیں پڑے گی — تمہارے والا ٹھیک ہے بالکل۔"

اچانک فجستہ کے ذہن میں ایک مہینہ پہلے والی شام اتر گئی جب وہ بختیار کو ساری کوٹھی میں تلاش کرتے کرتے گیراج کے سامنے پہنچی تھی تو اس کو بختیار کی پسندیدہ پرفیوم کی ایک لکیر سی سنگھائی دی تھی۔ اس نے شکاری کتیا کی طرح رک کر دو

سیدھے اور ایک الٹا چکر کاٹا تھا اور پھر حیرانی سے گیراج کا دروازہ دیکھا تھا جو آج زندگی میں پہلی مرتبہ اندر سے بند تھا۔ نجمتہ نے پچنے برابر نکلی گانٹھ سے آنکھ لگا کر دیکھا تو اندر سرخ بدن والی فراری سپورٹ کھڑی تھی اور اس کی ہڈ اتری ہوئی تھی۔ دونوں سیٹوں پر جھالر والا سفید کپڑا چڑھا تھا جس کی ڈوری سیٹوں کی پشت پر پلاسٹک کے نازک سے بکل میں بندھی تھی۔ سامنے دونوں پہیوں کے درمیان مڈگارڈوں کی ڈھلانوں پر ہاتھ رکھے بختیار زمین پر بیٹھا تھا اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نجمتہ نے بہت کوشش کی لیکن اسے ٹھیک سے نظر نہ آیا کہ بختیار کر کیا رہا ہے۔ ایک دو تین اندازے لگانے کے بعد جب اس کے ذہن میں یہ تصویر ابھری کہ بختیار نے خودکشی کر لی ہے اور وہ مر چکا ہے تو اس نے زور کی چیخ ماری اور دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے لگی۔ بختیار گھبرا کر اٹھا، اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور دروازہ کھلتے ہی نجمتہ دیوانوں کی طرح اس کے ساتھ لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ اسی دن سے پتہ نہیں کیوں نجمتہ کو لال فراری بری لگنے لگی اور اس کے برا ماننے پر بختیار نے چوری چھپے فراری سے ملنا شروع کر دیا۔

بختیار کو فارایسٹ کے دورے سے ایک مہینے بعد ہی لوٹ آنا تھا۔ لیکن جس جہاز سے وہ گیا تھا، اسی جہاز میں چرس سمگل کرنے والا ایک نوجوان بھی تھا۔ اس کی اور نوجوان کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں، پھر جب دونوں جہاز سے اتر کر لاؤنج کی طرف جا رہے تھے تو دونوں بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کرتے جا رہے تھے۔ نوجوان نے راستے میں اپنا تھیلا بختیار کو دے کر پتلون کی پیٹی بھی کسی تھی۔ جب اس تھیلے والے نوجوان کے اوور کوٹ کے شولڈر پیڈز کاٹے جا رہے تھے تو اس کا پاسپورٹ اور ہیلتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ بختیار کے ہاتھ میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بختیار کو ہانگ کانگ میں روک کر شامل تفتیش کر لیا گیا تھا اور اس کے تین مہینے اس بک بک میں ضائع ہو گئے تھے۔ دو مرتبہ اس کے والد ملک افتخار شمس الدین اس سے ملنے ہانگ کانگ آئے اور دونوں مرتبہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ناکام واپس آ گئے۔ بختیار کی ضمانت ہانگ کانگ کے سب سے بڑے تاجر نے دی تھی اور وہی اس مقدمے کی پیروی بھی کر رہا تھا۔

چار مہینے بائیس دن اور سات گھنٹے بعد جب بختیار واپس وطن پہنچا تو کسی کو اس کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ فروری کے آخری ہفتے کی شام تھی، شام کے چھ بج کر

بیس منٹ ہوئے تھے اور فجستہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اپنے سامنے اچانک بختیار کو دیکھ کر اس کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ ایک ہی جست میں وہ اس زور سے بختیار کے گلے سے جا کر لپٹی کہ اس کا کیمرہ کندھے سے لڑھک کر اس کی کلائی میں آ گیا۔ وہ تو اگر اس نے موٹی رولیکس نہ باندھی ہوتی اور وقت پر ہاتھ اوپر نہ اٹھا لیا ہوتا تو کیمرہ اپنے سارے الیکٹرونک سسٹم کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا تھا۔

فجستہ نے بختیار کو کھینچ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر باندری کی طرح اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ پھر وہ اپنے قصے کہتا رہا اور وہ اپنے دکھڑے روتی رہی۔ جدائی کے غم، فرقت کی کہانیاں، اکیلے پن کا احساس اور جب بختیار نے گردن گھما کر دیکھا تو صوفے کے پہلو میں چھوٹی تپائی پر اس کا سونی پڑا تھا اور اس کی تار زمین پر گری ہوئی تھی۔ سونی وی سی آر کا خوبصورت پلگ مٹی اور گرد سے مٹیالا ہوگیا تھا اور اس کے ساتھ ایک موٹا سا تنکا چمٹا ہوا تھا۔ فجستہ نے بختیار کے مڑے ہوئے چہرے کی ٹھوڑی اپنے مخروطی ہاتھ سے اپنی طرف پھیر کر کہا "وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میرا وی سی آر تمہارے جانے کے ایک مہینہ بعد خراب ہوگیا اور مجھے مجبوراً تمہارا سونی نکالنا پڑا — دیکھو میں نے اسے کس محبت سے اور احترام کے ساتھ رکھا ہے۔ ہر وقت اس پر آئرش لنن کا سرویٹ رہتا ہے۔" بختیار نے جب پھر وی سی آر کو گردن گھما کر دیکھا تو فجستہ نے تڑپ کر کہا "آئی ایم سوری بختیار، یہ دیکھو ابھی گرا ہے — ابھی ایک منٹ پہلے اس پر تھا — میں جب اچھلی ہوں تو میرے جھل سے اڑ کر قالین پر جا گرا — میں تو اسے تمہارا محبوب سمجھ کر اس سے اور بھی پیار کرتی رہی ہوں۔ آنسٹلی!"

بختیار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور پوچھنے لگا "یہ کوئی نئی سیریز ہے؟" فجستہ نے اپنا پاؤں کھجاتے ہوئے کہا "وہی ہے جو تم چھوڑ کر گئے تھے۔"

پھر پتہ نہیں اس کو کیا ہوا..... وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی، ٹی وی بند کیا اور سائیڈ بورڈ سے چابیاں اٹھاتے ہوئے بولی "میں ابھی سب کو جا کر بتاتی ہوں کہ تم آ گئے ہو اور ابھی سب کو اکٹھا کر کے لاتی ہوں، گیٹ ٹوگیدر کے لیے۔"

بختیار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور فجستہ تیزی کے ساتھ دروازے

سے باہر نکل گئی۔ اس کی موٹر سٹارٹ ہونے کی آواز آئی، پھر اس کے پہیوں کی سکریچ سنائی دی اور وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

بختیار نے اپنا سر صوفے کی پشت پر ڈال دیا۔ بائیں پیر سے دائیں کا موکیشن اتارا اور دائیں سے بائیں کا۔ پھر دونوں پیر اوپر کر کے بیٹھ گیا۔ وہ اتنی لمبی فلائٹ کے بعد بالکل تھک چکا تھا اور اپنے سونی کو اس طرح بے آبرو دیکھ کر نڈھال ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں ہتھیلیوں سے دبائیں اور اندھیرا کر کے بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کے کان میں ایک مدھم سی آواز رس گھولنے لگی "بختیار — بختیار — سویٹ ہارٹ بختیار — !"

اس نے ہاتھ ہٹا کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے نظر کی، چھت کو دیکھا، سر کھجایا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میٹھی سی آواز آئی۔

"ادھر دیکھ جان من — میری طرف — اپنے سونی کی طرف — "

بختیار نے پلٹ کر دیکھا تو وی سی آر کی سبز بتی بارہ تیس! بارہ تیس!! بارہ تیس!!! کر کے جلنے لگی تھی اور اس کا پلگ ابھی تک اسی طرح قالین پر پڑا تھا۔

بختیار کو اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تو سونی نے ہنس کر کہا "محبتوں میں کنکشنوں کی ضرورت نہیں ہوتی بختیار! نہ تار کی نہ پلگ کی، نہ میل کی نہ فی میل کی — اس کے لیے تو بس محبوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف اسی کے دم قدم سے ساری روشنیاں ہوتی ہیں، کنیکشن سے نہیں۔"

بختیار اس بیان اور اس ماجرے کے درمیان لٹک کر رہ گیا۔

سونی نے کہا "شرم آتی ہے اور کہے بنا رہا بھی نہیں جاتا کہ فجستہ نے تیرے بعد اچھا نہیں کیا۔ وفا کے نام کو بٹہ لگایا اور تجھے بھول بھال کے تیرے ہی گھر میں اک اور گل کھلایا۔"

بختیار کو وی سی آر کی اس بات پر سخت غصہ آیا۔ چاہتا تھا کہ دھکا مار کر اس کو مع تپائی کے زمین پر گرا دے کہ ٹی وی کی سکرین روشن ہو گئی اور سامنے اس کے گھر کا منظر چلنے لگا۔

لان پر بہت سے لوگ جمع ہیں، ہائی ٹی کا سامان بہم ہے اور مہمان خوش گپیوں

میں مصروف ہیں۔ فجستہ کے ساتھ اس کی دونوں سہیلیاں ندیمہ اور رضا بھی میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ کل گیارہ اشخاص ہیں۔ سب اپنی اپنی شیخی بگھار رہے ہیں..... کوئی زبان سے، کوئی آنکھوں سے، کوئی زلفوں سے، کوئی اپنے انداز نشست سے، کوئی کسی کو دیکھنے اور دیکھتے رہنے سے۔ ہر شخص اپنے آپ پر سپاٹ لائٹ فٹ کروا رہا ہے۔ مسعود فجستہ کو دیکھ کر غٹرغوں، غٹرغوں کر رہا ہے اور جدھر وہ جاتی ہے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے — اچانک سکرین پر وقفہ ابھرتا ہے — بختیار چیخ کر پوچھتا ہے — "وقفہ کیوں سونی؟ — وقفہ کیوں؟" اور سونی بڑے سادھارن طریق پر کہتا ہے "آہستہ بختیار آہستہ — آرام سے میری جان — دھیرج سے — میرے پاس ٹیپ کم تھا اس لیے میں غیر ضروری سین حذف کرتا گیا۔"

پھر سین ابھرا کہ سب لوگ چلے گئے ہیں اور مسعود اور فجستہ رہ گئے ہیں۔ مسعود نے فجستہ کا پاؤں اپنی گود میں رکھا ہوا ہے اور اس کو سینڈل پہنا رہا ہے۔ پھر دونوں اٹھتے ہیں اور کچن میں چلے جاتے ہیں — سونی نے کہا "میں نے یہ سین بڑی مشکل سے بنایا ہے جانی۔ لانگ شاٹ ویسے بھی ایک مشکل کام ہے لیکن جب روشنی کم ہو اور دروازہ آدھا کھلا ہو تو کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہاری خاطر تو ہماری جان بھی حاضر ہے اس لیے میں نے لڑکھڑا لڑکھڑا کے اور گھوم گھوم کے یہ شاٹ بنایا ہے۔"

فجستہ کھانے کی میز پر بیٹھی ہے۔ مسعود بٹلر کا ایپرن باندھے اور سر پر بڑی سی ٹوپی لگائے اس کے لیے آملیٹ بنا رہا ہے اور ٹوسٹ سینک رہا ہے۔ دونوں چیزیں لا کر فجستہ کے سامنے رکھتا ہے اور خود ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر سلائس کھانے لگتا ہے۔ فجستہ اپنا آدھا آملیٹ کاٹ کر مسعود کو دیتی ہے۔ مسعود شوق اور محبت کے ساتھ کھاتا ہے۔ پھر فجستہ کا آدھا پیا ہوا گلاس اٹھا کر منہ کو لگا لیتا ہے۔

بختیار کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تو سونی نے رک کر کہا "اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہو تو بند کر دوں۔"

"نہیں نہیں، چلاؤ چلاؤ۔" بختیار نے رعب سے کہا۔ "میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے اور کون کون لوگ ادھر آتے رہے

ہیں۔"

سونی نے کہا "چھوڑو، دفع کرو۔ جب تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو میرا سرکٹ جلنے لگتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے سارے فیوز ایک ساتھ اُڑ گئے ہوں۔"

پھر بختیار نے دیکھا کہ مسعود اور فجستہ کیرم کھیل رہے ہیں اور دونوں میں سے جو کوئی بھی گوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنا سر بورڈ پر آگے کو لے آتا ہے۔ دوسرا اپنا ماتھا آگے لا کر اس جھکے ہوئے سر پر ٹکا دیتا ہے اور تین تین چار چار منٹ کے بعد ایک گوٹ چلتی ہے۔

ایک سین میں مسعود اور فجستہ لمبے صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے بازو دوسرے کی گردن کے پیچھے سے گزار کر ایک دوسرے کے کندھے پر رکھے ہوئے ہیں۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ وہ ایک نہایت ہی بور ڈرامہ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دے رہے ہیں۔

جب اگلا سین آیا تو بختیار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فجستہ مسعود کا سر اپنی فرنچ شفون کی قمیض کے کندھے سے لگائے اس میں "جین سنگ" آئل جھس رہی ہے اور ہولے ہولے کچھ گن گنا رہی ہے — بختیار نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ نہ سکا۔ کوئی فوک گیت لگتا تھا جس میں محبت کے عہدو پیمان ہوا کرتے ہیں — بختیار کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے تو سونی نے کہا "صبر! اے تاجر بچے! انسانوں کے یہی کام ہیں، یہ آج سے نہیں ازل سے یہی کچھ کرتے آئے ہیں۔ محبت کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ پہلے ان سے جانے میں یا انجانے میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے، پھر ساری عمر احساس جرم میں گزر جاتی ہے۔ ہمیں دیکھو اور ہم سے پوچھو کہ تمہاری یاد میں ہم نے کس طرح سے یہ گھڑیاں کاٹی ہیں۔ سارے تہہ خانے میں کسی نے بھی خوشی کا ایک ثانیہ نہیں دیکھا۔ سب تمہی کو یاد کرتے رہے ہیں۔"

"میں بھی تمہیں یاد کرتا رہا ہوں سونی" بختیار نے بلبلا کر کہا اور اٹھا کر سونی کو اپنی گود میں ڈال لیا۔ اس کی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی اور وہ سونی کے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سونی کے اندر سے خڑخڑ کی ایسی آواز آنے لگی

جیسے ہاتھ پھروانے والی بلی سے آیا کرتی ہے۔ بختیار نے سونی کو گود سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا تو اس کے اندر سے ایسی خوشبو آنے لگی جیسے شروع گرمیوں میں جسموں سے آیا کرتی ہے۔

سونی نے بڑی مدھم سرگرمی میں کہا "چلو نیچے تہہ خانے میں چلیں۔ سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ذرا ٹھہرو!" بختیار نے کہا "نجستہ کو واپس آ جانے دو۔"

"دفع کرو نجستہ کو۔" سونی نے چڑ کر کہا "لعنت بھیجو اس چھنال پر، آوارہ کتیا پر — چلو!"

بختیار سونی کو اسی طرح سینے سے چمٹائے تہہ خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

چھے چھیکا بتیس

اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ وہ کس کا عہد حکومت تھا لیکن کسی بادشاہ کا دور تھا۔ پتہ نہیں وہ آمریت کا بادشاہ تھا یا جمہوریت کا بادشاہ تھا یا بادشاہیت ہی کا بادشاہ تھا لیکن تھا بہت منہ زور اور مطلق العنان حاکم۔ مگر اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتا تھا اور رعایا کو تنگ نہیں کرتا تھا۔ عوام جس طرح چاہیں رہیں، جیسی چاہیں زندگی گزاریں، جن حالوں سے گزریں وہ اُن میں دخل نہیں دیتا تھا۔ بس عوام سے پرے رہ کر ہر حال میں خوش تھا!

اس بادشاہ کے دور میں ہمارے یہاں اکنامکس کے ایک پروفیسر تھے۔ یہ تھے تو ایک مضافاتی کالج کے استاد لیکن اُن کی دانش کا شہرہ دور دور تک پہنچا ہوا تھا۔ اقتصادیات کا مشکل سے مشکل مسئلہ چنے کی کھیل کی طرح چھیل کر ہتھیلی پر رکھ دیتے تھے اور شک و شبہ کا چھلکا پھونک مار کر اُڑا دیتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ خود اُن سے اقتصادیات کے تکلیف دہ اور ٹیڑھے سوال پوچھے تھے اور پرسکون دل اور مفرح دماغ لے کر واپس گھر آیا تھا۔

میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ جب لوگوں کے پاس پیسہ بہت ہو جاتا ہے اور وہ بے حد امیر ہو جاتے ہیں اور اُن کے شہروں، علاقوں اور ملکوں میں دولت کی افراط ہو جاتی ہے تو وہ غریب کیوں ہو جاتے ہیں اور اس علاقے کو افراطِ زر کا مارا ہوا علاقہ کیوں مشتہر کیا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں کے شہریوں کو اس "افراطِ زر زدہ" علاقے سے دور رہنے کی ہدایت کیوں کی جاتی ہے؟

پھر میں نے اُن سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا دُنیا کے مانے ہوئے سو ماہرین

اقتصادیات دُنیا کو مہنگائی سے بچا سکتے ہیں؟

کیا قرض لینا ایک چھوت کی بیماری ہے جو عام شہریوں کو اپنی حکومت سے لگ جاتی ہے؟ اور کیا معیار زندگی بلند ہونے سے انسان میں درندگی کی صفات پھر سے پیدا ہو جاتی ہیں؟ اور وہ لوٹ کر پھر پتھر اور دھات کے زمانے کی طرف مراجعت کر جاتا ہے؟

پروفیسر صاحب نے مجھے سامنے بٹھا کر ایک طویل مگر دلچسپ اور خیال انگیز لیکچر دیا اور میرے کچے ذہن کی دھونسی ہوئی چھت سے بہت سے جالے دور کر دیئے!

پروفیسر ساعتی بہت ہی خوش گوار، رحم دل، سادہ مزاج اور ذہین اُستاد تھے جن کا اپنے ساتھی اُستادوں اور ہمعصر لکچرروں سے ایک الگ تعلق تھا اور وہ ہر مسئلے پر بڑی گہرائی کے ساتھ غور کرنے کے عادی تھے۔ اس غور و فکر نے اُن کی فردیت میں ایک عجیب طرح کی شان استغنا پیدا کر دی تھی اور وہ مشکل سے مشکل حالات سے سکاؤٹوں کی طرح سیٹی بجاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔

پروفیسر ساعتی کے مائکرو اقتصادیات پر لکھے ہوئے تحقیقی مقالے زیادہ تر غیر ملکی پرچوں میں چھپتے تھے اور اُن انگریزی مضامین کا یورپ کی دوسری زبانوں میں ساتھ ہی ترجمہ ہو جاتا تھا۔ ہر سال کم از کم ایک مرتبہ اُن کو ملک سے باہر ضرور جانا پڑتا۔ کبھی کسی سیمینار میں شرکت کے لئے، کبھی اپنے ایکسٹینشن لیکچروں کے سلسلے میں اور کبھی کسی ملک کی حکومتی دعوت پر جو اپنے مالی شعبہ اور اقتصادی سیٹ اپ میں تبدیلی کی خواہاں ہوتی تھی — اسی طرح اپنے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں جب کہیں اور جہاں کہیں کسی اقتصادی ورکشاپ کا قیام ہوتا، اس کے افتتاح کے لئے پروفیسر صاحب کو ضرور زحمت دی جاتی۔

پروفیسر ساعتی میں یوں تو ایک سکالر کی ساری خوبیاں موجود تھیں اور وہ اپنے مضمون کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی حاوی تھے اور اپنے ساتھیوں کی بڑے کھلے دل سے راہنمائی کرتے تھے اور اُن کے ساتھی اُن کو نوبیل لاریٹ کا درجہ دیتے تھے لیکن اس سارے تبحر علمی اور دانش برہانی کے باوجود اُن میں ایک ایسی چھوٹی سی کمی تھی جس نے اُن کے سارے ہمعصر اُستادوں، تمام ملنے والوں اور گھر کے ہر شخص کو

اُلجھن میں مبتلا کر رکھا تھا بلکہ اگر اُلجھن کے بجائے اُنہیں شرمندگی میں مبتلا کر رکھا تھا کہیں گے تو زیادہ مناسب ہو گا۔

پروفیسر صاحب چھ ضرب چھ کو چھتیس کے بجائے بتیس سمجھتے تھے اور چھ چھکے چھتیس کہنے کے بجائے چھ چھکے بتیس ہی کہتے تھے۔ اُنہیں پختہ یقین تھا کہ چھ ضرب چھ چھتیس نہیں ہوتے بلکہ بتیس ہوتے ہیں اور جو لوگ اُنہیں چھتیس سمجھتے ہیں وہ غلط سمجھتے ہیں اور حماقت کا اظہار کرتے ہیں!

اس مسئلے پر کئی مرتبہ اُن کی ریاضیات کے پروفیسروں سے بحث بھی ہوئی اور فزکس کے اُستادوں کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا۔ شماریات والوں نے بھی احتجاج کیا اور کمپیوٹر سائنس دانوں نے بھی مختلف کمپیوٹروں پر اُنہیں بار بار ملٹی پلائی کر کے دکھایا لیکن اُن کی تسلی نہ ہوئی۔ تسلی ہونا تو ایک طرف، اُنہوں نے اس ایکویشن کو تسلیم ہی نہیں کیا۔

لیکن جب اُن کے مد مخالف گروہ نے پروفیسر ساعتی سے چھ چھکے بتیس ہونے کا ثبوت مانگا تو اُنہوں نے کہا "میں اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتا، عین اس طرح جس طرح ہم سارے ریاضیاتی قاعدوں اور کلیوں کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن میں اپنے اس پہاڑے کے زور پر سارے سوالوں کے صحیح جواب نکال سکتا ہوں اور آپ کی تشفی کر سکتا ہوں" — اُن کے اس جواب دعوے پر پہلے تو اُن کے ساتھی پروفیسروں نے اُنہیں اپنی مہارتی کی منطق پر عام سوال حل کرنے کے لئے دیئے اور جب اُنہوں نے، اُن کے سامنے، بڑی آسانی کے ساتھ سارے سوالوں کے جواب چھ ضرب چھ بتیس مان کر نکال دیئے تو پروفیسروں کی سٹی گم ہو گئی۔

پھر اُن لوگوں نے پروفیسر ساعتی کو کچھ مشکل اور پیچیدہ سوال دیئے اور جب اُنہوں نے وہ بھی اپنے حساب سے حل کر کے دکھا دیئے تو پھر اُنہیں فکر پڑی اور یہ معاملہ فزکس کے پروفیسروں تک پہنچا دیا گیا۔

فزکس کے پروفیسروں نے کشش، رفتار، روشنی اور ولاسٹی کے سوال دے کر کہا "ساعتی صاحب ذرا دھیان رکھنا۔ ذرا سی بھی غلطی ہو گئی تو شٹل نے زمین پر گر جانا ہے اور ہزاروں جانوں کا نقصان ہو جانا ہے۔"

پروفیسر ساعتی نے مسکرا کر کہا "کوئی بات نہیں جی، اللہ فضل کرے گا۔ اللہ مہربانی کرے گا۔" پھر اُنھوں نے چھ ضرب چھ کو بتیس مان کر حرکیات کے ایک پیچیدہ مسئلے کو جو حل کرنا شروع کیا تو پندرہ بیس منٹ میں مفروضے کے ریوڑ کے گرد گڈریئے کی طرح چکر لگا کر ٹھک سے رکے اور کھٹ سے اس کا جواب نکال کر سامنے رکھ دیا۔

پروفیسر شفیق نے کہا "سر! یہ جو بتیس میں چار کی کمی رہ جاتی ہے، وہ آپ کس طرح سے پوری کرتے ہیں؟"

پروفیسر ساعتی نے خوش ہو کر شفیق صاحب کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا "مقام شکر ہے کہ کسی نے پوچھا تو ورنہ ابھی تک تو سارے میرے ساتھ لڑتے ہی رہے ہیں۔"

پھر اُنھوں نے فزکس کے پروفیسر شفیق اور شماریات کے پروفیسر جواد کو ساتھ بٹھا کر اپنا فارمولا سمجھانا شروع کر دیا۔

پروفیسر صاحب اپنی ساری بین الاقوامی شہرت کے باوصف پچھلے اٹھارہ برس سے لیکچرر ہی چلے آ رہے تھے اور یہ ساری مدت اُنھوں نے بہاول نگر کے کالج میں ہی گزار دی تھی۔

جب کبھی پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو کا زمانہ آتا اور لیکچرروں کے اسسٹنٹ پروفیسر بننے کے چانس قریب آتے تو پروفیسر ساعتی بھی اعلیٰ درجے کا سوٹ زیب تن کئے، غیر ملکی رسالوں میں اپنے چھپے مقالوں کا پلندہ اُٹھائے اور غیر ملکی حکومتوں کے شکریے کے خطوں کی فائل بغل میں دبائے انٹرویو کے لئے پہنچ جاتے۔

لیکن پروفیسر صاحب کے حاسد اور بدخواہ ہمعصر اُستاد انٹرویو بورڈ کے ہر ممبر کو ایک چھوٹی سی چٹ لکھ کر اندر بھجوا دیتے کہ پروفیسر ساعتی سے انٹرویو کے دوران یہ ضرور پوچھئے گا کہ چھ چھکے کتنے ہوتے ہیں، اس سے آپ کو اُن کی دماغی حالت کا خود اُن کی زبانی پتہ چل جائے گا۔

پروفیسر صاحب انٹرویو دے کر ہمیشہ خوش خوش باہر نکلتے اور گھر والوں کو جا کر کامیابی کا مژدہ سناتے لیکن نتیجہ نکلنے پر وہ لیکچرر کے لیکچرر ہی رہ جاتے۔ انٹرویو کے آخر میں اُن سے ہر بار "چھے چھکے —" پوچھا جاتا اور وہ ہر بار بتیس بتا کر گھر واپس آجاتے۔